Year 2023; Vol 02 (Issue01)
P. 27-39 https://journals.gscwu.edu.pk/

فہمیدہ نوشین
ایم فل اردو سکالر اسلامیہ یونیورسٹی، رحیم یار خان کیمپس
یوسف نون
لیکچرار اُردو، اسلامیہ یونیورسٹی، رحیم یار خان
شاہد حسین
لیکچرار اُردو، اسلامیہ یونیورسٹی، رحیم یار خان

Fahmida Nosheen
MPhil Urdu Scholar Islamia University, Rahim Yar Khan.

Yusuf Noon
Lecturer in Urdu, Islamia University, Rahim Yar Khan.

Shahid Hussain
Lecturer in Urdu, Islamia University, Rahim Yar Khan

مستنصر حسین تارڑ سفر نامہ "لاہور آوارگی" کا تاریخی و تہذیبی شعور

Mustansar Hussain Tarar's travelogue "Lahore Awargi" historical consciousness

Abstract:

The study of archeology is a subject in which all curious minds, which are not fully acquainted with this favorite pastime, are nevertheless more or less interested. Investigating about the past is a sign of curiosity and inquisitiveness for all minds, but such studies leave deep impressions on the mind of course, the eye that has become accustomed to the bustling streets of Anarkali, the busiest markets of the modern city, its thriving industries, its commercial activities and the bustling business, and the eye that is accustomed to the varied and crowded scenes of the astonishing railway station. It is the mill which connected the capital of the Punjab with the great centers of Indian civilization, where men from the remotest regions of the extreme north and east of the empire could be seen. All are well mannered, peaceful and contented. An eye which has become accustomed to the view of the trees outside the gates of the city and the scenery of the bazaar with the excellent canal flowing alongside them, would certainly be repulsive if shown the present view of Lahore.The outstanding quality of Mustansar Hussain Tarar's travelogues is that his readers

love things, landscapes, nature, civilizations, traditions, clothes, seasons, flowers and even the hardships of travel.

Keywords: Travelogue, Tourist , History and culture, Lahore, Mustansar Hussain Tarar

قرآن میں سورۃ العنکبوت میں اللہ فرماتا ہے کہ

ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلق کی ابتدا کی ہے۔

سیاحت کا شوق انسان کو مختلف شہروں کی سیر کرواتا ہے، وہ ملکوں گھومتا ہے اور خلاق عالم کے بنائے ہوئے مناظر قدرت سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ انسان کبھی نہ کبھی اپنے گھر کو چھوڑ کر دوسرے شہر یا ملک کا سفر کرتا ہے لیکن ایسے بھی لوگ ہیں جو اپنے سفر کی روداد سپرد قلم کرتے ہیں. اکثر سیاح گھومنے پھرنے، کھانے پینے اور تصاویر لینے میں تھک جاتے ہیں بجائے اس کے کہ مشاہدے کے بعد اپنے تاثرات قلمبند کریں اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہر سیر کرنے والے کو حساس دل اور عبرت کی نگاہ میسر بھی نہیں ہوتی اکثر لوگ خالی دل و دماغ کے ساتھ گھوم پھر کر وقتی تفریح کرتے ہیں اور واپس آنے کے بعد اپنے اندر کسی طرح کے جذبات نہیں پاتے۔ جب کہ زندہ دل انسان کے جذبات میں سفر کے بعد ایک تلاطم پیدا ہو جاتا ہے روح تڑپ اٹھتی ہے اور شعور بیدار ہو جاتا ہے بعض لوگ ان جذبات کی ترجمانی کے لیے گفتگو کا سہارا لیتے ہیں اور بعض قرطاس و قلم کا۔

سیاح اگر ذوق سیارگی کے ساتھ شستہ کلامی اور عمدہ طرز تحریر کی دولت سے بھی مالامال ہو تو پھر اپنے سفر نامے کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ مطالعے کے وقت قاری خود کو مسافر تصور کرتے ہوئے گھومتا ہے، تفریح کرتا ہے اور خوب محظوظ ہوتا ہے حتی کہ سفر نامہ پڑھنے کے بعد اس کے دل میں بھی سفر کرنے کی خواہش تیز تر ہو جاتی ہے اور یہی چیز سفر نامے کی عمدگی پر دلالت کرتی ہے کہ مسلسل اس تصور اور خیال میں تیر تا رہے کہ وہی سیاح ہے، وہی کوہ و دشت کی پہنائیوں میں رواں ہے، وہی آبشاروں اور جھرنوں کے دیدار میں محو ہے، سمندر کی لہریں سر پٹخ پٹخ کر اسی کے استقبال میں ہلکان ہوئی جاتی ہیں، وہی بلند و بالا عمارتوں اور بوسیدہ کھنڈرات کے درمیان سرگرداں ہے اور یہ تحریر بس اسی کے جذبات کی حقیقی ترجمانی کر رہی ہے۔

اس ضمن میں شہزاد منظر اپنے مضمون ''سفر نامہ نگاری'' میں لکھتے ہیں۔

'' جدید سفر نامے میں اسلوب اور طرز بیان بڑا اہم سمجھا جاتا ہے اور ایسے سفر ناموں کو زیادہ پذیرائی ملتی ہے جو فکشن کی طرز پر لکھے گئے ہوں۔'' (۱)

ڈاکٹر قدسیہ قریشی سفر نامہ کے بارے میں لکھتی ہیں:

.''سفر نامہ کے معنی داستان سفر، روداد سفر کے قصے کے ہیں جسے تحریری طور پر پیش کیا گیا ہو۔''(۲)

بنیادی طور پر سفر کے تین مقاصد ہیں جس کی وجہ سے مسافروں کی اکثریت عازم سفر ہوتی ہے وہ تجارت اور سوداگری ہے۔

دوسری بنیادی وجہ اعزہ اقارب سے ملاقات کرنا ہے یوں انسان اپنے دور دراز کے رشتہ داروں اور عزیزوں سے ملنے جلنے اور ان کی خبر گیری کے لئے سفر کا قصد کرتا ہے۔

سفر کرنے کی تیسری سب سے بڑی وجہ تفریح طبع ہے لہذا نئے اور اجنبی مقامات کی سیر کرنے سے نہ صرف دماغ تر و تازہ ہوتا ہے بلکہ انسان خوش ہو جاتا ہے ۔ زندہ دل انسان سفر اور نئے مقامات سے عبرت حاصل کرتے ہوئے اللہ تعالی کی قدرت کاملہ کا نظارہ کرتے ہیں اور یقین و ایمان کی نئی منزلوں کی جانب رہنمائی پاتے ہیں ۔ سیر و سیاحت کا یہی حقیقی اور اصل مقصد ہے اور یہی قرآن مجید کا مطلوب بھی ہے۔

پروفیسر جمیل احمد انجم جدید سفر نامے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "قیام پاکستان کے بعد جن سفر ناموں نے جدید سفر ناموں کی بنیاد رکھی وہ بیگم ریاض الدین کے لکھے ہوئے ہیں۔ دھنک پر قدم اور سات سمندر پار اپنے حسن بیان، رومانوی اسلوب اور تاثرات کے اعتبار سے بہت عمدہ ہیں۔ بیگم اختر کو اپنے خاوند کے ساتھ سرکاری دوروں پر یورپ ایشیا اور امریکہ کے متعدد ممالک میں جانے کا اتفاق ہوتا ہے اس نے جو کچھ محسوس کیا اپنے ذاتی تاثرات کے ساتھ پیش کیا ہے۔"(۳)

جدید سفر نامے کا آغاز بیسویں صدی سے ہوتا ہے۔ دور جدید تک ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے جدید سفر نامے نے کئی صورتیں بدلی ہیں۔ جدید دور کے سفر ناموں میں واضح طور پر گزشتہ ادوار کے سفر ناموں سے انحرافی کیفیت نظر آتی ہے۔ ان سفر ناموں میں سفر نامہ نگار صرف ماضی کی مراجعت نہیں کرتا بلکہ عہد رفتہ کی بازیافت بھی کرتا ہے۔

کامیاب سفر نامہ لکھنے کے لئے فنی لوازمات کی پاسداری ضروری ہے جدید سفر نامے کے چند فنی لوازمات جن کو اہم سمجھا جاتا ہے۔ وہ درج ذیل ہیں۔

قوت مشاہدہ، تجسس، غیر جانبداری، شگفتہ اسلوب، منظر نگاری اعتدال و توازن اور سچی سیاحت

راغب شکیب سفر نامے کی تکنیک پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سفر نامہ میں دو خوبیوں کا ہونا ضروری ہے یہ کہ سفر نامہ نگار نے واقعی سفر کیا ہو دوسرے یہ کہ جو لکھے وہ سفر کے متعلق ہو اور غیر متعلق واقعات کی آمیزش سے سفر نامہ پاک ہو اور سفر نامے کا مقصد صرف افسانہ لکھنا نہ ہو۔"

مستنصر حسین تارڑ یکم مارچ 1939 میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق گجرات کے کاشت کار گھرانے سے ہے۔ ہیڈن روڈ پر واقع لکشمی مینشن میں ان کا بچپن گزرا۔ گورنمنٹ کالج سے ایف، اے کرنے کے بعد برطانیہ اور دوسرے ممالک کا رخ کیا۔ وہاں ادب اور تھیٹر کو سمجھنے اور برتتے ہوئے پانچ سالوں میں ٹیکسٹائل انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر کے لوٹے۔ انہوں نے ٹی وی اسکرین سے لے کر ادب کے ہر شعبے میں وہ مقام پایا جو کم ہی کسی کے حصے میں آتا ہے۔ 400 ڈراموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے اور پی ٹی وی کی صبح کی نشریات صبح بخیر" کی میزبانی نے انہیں اپنے ناظرین کے گھر کا فرد بنایا لیکن اس نے انہیں ادب سے غافل نہیں ہونے دیا۔ ان کا پہلا سفر نامہ "نکلے تیری تلاش میں" جو یورپی ممالک کی سیاحت سے واپسی پر لکھا۔ ۱۹۷۱ میں شائع ہونے والا یہ سفر نامہ نہ صرف اس صنف میں ایک منفرد تجربہ ثابت ہوا بلکہ تارڑ صاحب کو ممتاز لکھنے والوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ مستنصر حسین تارڑ 70 سے زائد کتب کے مصنف ہیں اور ہر آنے والی کتاب کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ان کے ناول بہاؤ کو اردو فکشن کا سنگ میل قرار دیا گیا۔

"راکھ" کو 1999 میں وزیر اعظم ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ان کی فنی عظمت اور ادبی خدمات کے اعتراف میں ۲۰۰۲ میں دوحہ قطر لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ دیا گیا۔ اس کے علاوہ صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی اور ستارہ امتیاز اور دیگر کئی اعزازات پیش کئے گئے۔

تارڑ کے حوالے سے ڈاکٹر غفور قاسم لکھتے ہیں۔

تارڑ کے سفر ناموں میں داستان کی سی داستان طرازی، فکشن کی سی فسانہ سازی، ڈرامہ کی سی منظر کشی، آپ بیتی کا سا لطف اور جگ بیتی کی سی لذت ہے۔ ان کے سفر ناموں سے اردو ادب کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ اور مطالعہ پاکستان کے طالب علم بھرپور فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔"(۴)

"لاہور کی ابتدائی تاریخ اس قدر گمنامی کے اندھیرے میں ہے کہ اس کے قیام کی کوئی بالکل درست تعریف بیان کرنا ناممکن ہو گیا ہے اس بارے میں قدرے اشتباہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اس کو ہندو راجپوتوں نے آباد کیا تھا۔ مستند عرب جغرافیہ دانوں کی تحریروں اور سندھ کے اولین مسلمان مورخین کی پیش کردہ آرا کے مطابق اس بات سے مزید برآں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خلافت کے ابتدائی دنوں میں اور ساتویں صدی عیسوی کے وسط میں لاہور ایک خاص اہمیت کا شہر تھا۔"(۵)

لاہور آوارگی اس حوالے سے تارڑ صاحب لکھتے ہیں کہ:

ان دنوں میں سندھ اور پنجاب کے دو سفر نامے مرتب کر رہا تھا اور پنجاب کی کتاب میں لاہور کی کچھ آوارگیاں بھی شامل تھیں تو یہ سرفراز ملک گجر تھا جو اس قبیلے کا پہلا شریف گجر تھا جس نے مجھے مائل کیا کہ مجھے لاہور کے بارے میں ایک الگ کتاب لکھنی چاہیے اور میں فوراً مائل ہو گیا۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ میں نے سنگ میل

کے افضال احمد کے دریافت کرنے پر کہ تارڑ صاحب کیالاہور آوارگی مکمل ہوگئی تو میں نے کہا تھا افضال! میں نے اب تک جو کچھ لکھا ہے اسے فوراً شائع کر دو کہ ہر شب لاہور اپنا ایک اور روپ میرے سامنے سجا دیتا ہے اور میں لکھتا ہی چلا جاتا ہوں یوں تو لاہور آوارگی کبھی مکمل نہ ہو گی۔ ''اگر میری قبر لاہور میں ہوئی تو

بقول غالب

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ، بعدِ مرگ

ہلتے ہیں خود بخود مرے، اندر کفن کے، پاؤں(۶)

میں اپنی خوش بختی پر فخر کرتا کہ مجھے لاہور کی مٹی نے قبول کیا، میں تب بھی لکھتا چلا جاؤں گا۔۔ مجھے فوراد فن کر دو۔

موت، موت ہے اور لاہور لاہور ہے

ہر انسان کی اپنی جائے پیدائش سے محبت، عقیدت اور الفت دیدنی ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں بات کرتے، بہترین گمان کرتے اور قصیدے پڑھتے نہ صرف خود محظوظ ہوتا ہے بلکہ وہ مدھم جذبوں کی آنچ پر قاری کو بھی اپنے سحر میں جکڑے رکھتا ہے۔

۴۰۸ صفحات پر مشتمل سفر نامہ ''لاہور آوارگی'' سنگ میل پبلیکیشنز نے ۲۰۰۰ میں شائع کیا۔

لاہور میں ہونے والی تعمیرات اور ان کے نتیجے میں ہونے والے تاریخی ورثے کو ہونے والے نقصان پر لکھتے ہیں۔

''لاہور آوارگی محض ایک تاریخی و تاثراتی بیانیہ نہیں ہے، ایک احتجاج بھی ہے، نہ صرف ایک مرتبہ پھر افغانیوں نے اس شہر پر قبضہ کر لیا ہے بلکہ ترقی کے نام پر اس کے چہرے کو مسخ کیا جا رہا ہے۔ اس کی سب تاریخی نشانیاں مسمار کی جا رہی ہیں، اس کے درمیان میں ایک دیوار برلن کی تعمیر کر کے اس کی پہچان کو معدوم کر دیا گیا ہے۔ میں اس شہر بے مثال کا نوحہ گر ہوں، جانتا ہوں کہ میری فغاں کا کچھ اثر نہ ہو گا، میں نے بھی تو ارسطو کا کہا نہ مانا تھا کہ کبھی کسی سوداگر کو اپنا حکمران نہ بنانا، وہ تمھارے قدیم معبد ڈھا دے گا، عہد رفتہ کے سب قصر مسمار کر کے وہاں تجارتی منڈیاں قائم کر دے گا۔۔''

''ویسے میری کیا بساط، چوبرجی کی مغل شہزادی مہرالنسا بھی تو نوحہ کناں ہے۔ قدیم کلیساؤں پر آویزاں صلیبوں میں سے خون بہتا ہے۔ لکشمی چوک کی بربادی پر لکشمی دیوی کے آنسو نہیں تھمتے، جین مندر کے آثار مسمار ہو گئے۔۔ شاہ حسین فریاد کرتا ہے کہ شالیمار باغ جہاں کبھی اس کے میلہ چراغاں کے چراغ جلتے تھے اس کے برج منارے اور آبشاریں اور فوارے لرزش میں ہیں۔۔۔ کہ وہاں سے کوئی اور نج ٹرین چھک چھک کرتی گزرے گی۔ یہ شہر بے وفا تو نہ تھا مگر تو نے اسے برباد کر دیا۔''(۷)

''چوبرجی کے نام سے مشہور عمارت جو ملتان روڈ کے مغرب میں واقع ہے یہ دراصل اورنگزیب کی عالم فاضل صاحبزادی کے باغ کا دروازہ ہے۔ بیرونی دروازوں کو چمکدار روغنی ٹائلوں، نیلے اور سبز رنگ کی میناکاری اور خوبصورت نقش و نگار سے آراستہ کیا گیا ہے اور یہ کام اڑھائی صدیاں گزر جانے کے باوجود ابھی تک تر و تازہ اور نمایاں ہے یہ باغ دراصل نواں کوٹ شہر سے لاہور تک پھیلا ہوا تھا لیکن اب اس کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔''(۸)

''شہر سے تین میل کے فاصلے پر امرتسر کی سڑک پر واقع شالامار باغ کو لالچی حملہ آوروں حتیٰ کہ سکھ حکمرانوں کے ہاتھوں سخت نقصان پہنچا ہے۔''(۹)

اس کتاب کی ابتدا تارڑ صاحب کے اپنے صبح کی سیر کے ساتھیوں کے ساتھ کئے گئے اندرون لاہور کے دوروں سے ہوتی ہے۔ شروعات سفر لاہور کے قدیم محلوں، حویلیوں، بیٹھکوں، مسجدوں، مندروں اور گردواروں کے گرد گھومتی ہے ان کی تاریخ پر گفتگو ہوتی ہے پھر تارڑ صاحب ماضی میں یوں گم ہوتے ہیں کہ کتاب کا رنگ بدل جاتا ہے یہ کتاب ایک سفر نامے سے سوانح حیات بن جاتی ہے جس کا موضوع تارڑ صاحب اور ان کا شہر لاہور ہے۔ ان صبحوں شاموں کے قصے ہیں جو انہوں نے اس شہر میں گزارے۔ میلوں، تہواروں کی باتیں ہیں۔ ان ہستیوں کی یادیں ہیں جو خاک نشین ہو چکے ہیں۔ یوں تارڑ صاحب نے اس کتاب کے ذریعے پھر سے وہ زمانہ یاد کیا ہے۔ لاہور شہر کی تاریخ و تہذیب کے اوراق کھنگالتے غور کریں تو اصل اہمیت مستنصر حسین تارڑ کی ذات اور یادوں کو حاصل ہے۔

ڈاکٹر قدسیہ قریشی رقم طراز ہیں۔

سفر نامے زندہ واقعات کی تاریخ ہیں۔ سفر ناموں کو اپنے عہد کی تہذیبی تاریخ کہنا زیادہ صحیح ہو گا۔

Travelogues is a sort of cultural History written in the form of fiction and dairy. (10)

بیانیہ انداز میں لکھا گیا یہ سفر نامہ ۱۶ ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلا باب ''ایک دن رہیں لاہور میں'' چوک چکلہ کی کنجری کی مسجد جو مائی موراں (بعد ازاں بخاری مسجد کہلائی) کی مسجد کے نام سے مشہور ہوئی۔ مائی موراں بہترین رقاصہ تھی اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں لاہور ٹکسال سے اس کے نام کا سکہ جاری ہوا۔ حویلی نونہال سنگھ، الف لیلوی، پر شکوہ اور شاندار حویلی جسے لاہوری تاج محل کہنا بے جانہ ہو گا۔ داراشکوہ کا دروازہ، لاہور کا دروازہ جس کا رُخ دلی کی جانب تھا۔ جہاں سے دلی کا گورنر دارالشکوہ فجر کی نماز کے بعد لاہور کے گورنر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مرید کے طور پر پیدل اپنے مرشد میاں میر صاحب کے مزار پر حاضری دیتا تھا، اسی شاہی گزر گاہ میں چاٹی کی لسّی اور ماہر طبلہ نواز کے بیٹے سُریلا جاوید سے بطور سینئر ٹورازم آفیسر ملاقات ہوئی۔ حویلی نونہال کا بالائی منظر دیکھنے کے بعد ٹھیکیدار سلطان کا پوشیدہ شیش محل دیکھنے بالائی منزل پر جانا ایک اور معرکہ سر کرنے کے مترادف تھا، محمود غزنوی کے ایاز کی قبر، قرۃ العین کے لکھنؤ اور لاہور کے فرق کے علاوہ دینا ناتھ کی حویلی کا پس منظر بیان کیا گیا ہے۔

''بانی اس سرائے کا کُشتی اور پہلوانی کا شوقین عہد سکھنی میں لاہور گزر دہلی دروازے میں رہتا تھا اور صابن کا کام کر کے گزر اوقات کرتا تھا۔ انگریز سرکار کو تعمیر چھاؤنی و کوٹھیات کے لیے ٹھیکہ دار کی ضرورت ہوئی تو یہ شخص ٹھیکیدار مقرر ہوا چونکہ اس کی قسمت کا ستارہ دن بدن اوج پر تھا۔ تھوڑے عرصے میں ہزاروں بلکہ لاکھوں روپے کی عزت کا مالک ہو گیا۔''(۱۱)

سلطان ٹھیکیدار لاہور کی تاریخ کے اہم اور داستانوی کردار ہے۔ سلطان کی سرائے کا معمار، لاہور اسٹیشن کو تعمیر کرنے والا، انگریزوں کی چھاؤنی میاں میر کی کولونیل عمارتیں بھی اس کی نگرانی میں تعمیر ہوئیں لیکن ان شہکاروں کی قدر نہ کی گئی اور یہ کھنڈروں میں بدل گئیں۔

''مزار داتا گنج بخش کے ساتھ ایک محل ہے جس کو شیش محل کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے کیونکہ مسلمان بادشاہوں کے دور میں یہاں شیشوں کا محل موجود تھا ۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ جو حضرت داتا گنج بخش سے بہت زیادہ عقیدت رکھتا تھا۔ مہاراجہ کھڑک سنگھ کی بیوی اور نونہال سنگھ کی والدہ مہارانی چند کور نے 1895 میں اس مقبرے میں محرابی چھت والا کمرہ تعمیر کرایا۔ مقبرے کی انتہائی دلچسپ چیزوں میں ہندوستان کے مختلف بادشاہوں اور نوابوں کے پیش کردہ قدیم نسخہ جات اور فن خطاطی کے اعلیٰ نمونہ جات ہیں۔''(۱۲)

''جیمز ہاروے رابنسن مرحوم نے کہا تھا کہ تاریخ کو ایسا گمان بھی نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس کی فطرت ہی ایسی ہے اس کا مطالعہ سائینٹیفک طور سے نہیں کیا جاسکتا۔ ایک حد تک اس نقطہ نظر کی بنیاد یہ عقیدہ ہے کہ تاریخی حقائق زیادہ سے زیادہ بھی سچ ہوں گے تو پھر بھی محض تخمینی اور قیاس ہی رہیں گے۔

اٹلی کے عظیم مورخ وائی نے کہا ہے۔ ہر دور آنے والے دور کے لئے کیاری کی حیثیت رکھتا ہے ایک دور بوتا ہے، دوسرا دور کاٹتا ہے اس لئے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ہر دور اپنی نظیر آپ ہوتا ہے۔ اس جیسا اور کوئی دور نہیں ہوتا، وہ اپنی جگہ منفرد اور یکتا ہوتا ہے۔''(۱۳)

۱۴ ذیلی عنوانات کے تحت (باب دوم: ''آوارگی میں ہم نے لاہور کے زمانوں کی سیر کی) لاہور کی مسجدوں، حویلیوں، کوچوں، نہروں، مزاروں کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔

مہاراجہ رام چند کے بیٹے مہالوہ کے بسائے ہوئے شہر اور ایک مختصر پاٹ کی نہر جس کے ارد گرد پھولوں کا میلہ لگا ہوا ہے۔ پرندے، پہلوان اس نہر کے گرد اپنے لمحات کو مزید خوبصورت بناتے ہیں۔ عورتیں اس نہر پر کپڑے دھونے کے بعد سیاسی معاملات پر گفتگو کرتی نظر آتی ہیں اور اس کے کناروں پر جو گلشن بہار کے تھے وہ ذرا ذرا یاد ہیں۔

"مجھے یاد ہے ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو"

مصنف لکھتے ہیں کہ شہر کی دن رات کی ترقی اس نہر کو دفن کر گئی۔ اب وہ پرانے درخت تو موجود ہیں لیکن نہر کا وجود ہی نہیں ہے۔

موچی دروازے کے علاقے میں نواب میاں خان کی حویلی مشہور اور معروف تھی چونکہ اس عمارت میں کالا پتھر لگا ہوا تھا۔ اس لیے پتھراں والی حویلی کہلاتی تھی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس حویلی اور لاہور کی متعدد عمارتوں کو بارود سے بھر دیا تھا۔ اس پتھراں والی حویلی میں کسی سبب آگ لگنے سے جو ہولناک دھماکہ ہوا اور حویلی کی دیواریں اور پتھر ہوا میں اڑ کر پانچ پانچ کوس تک باہر جا پڑے اس حویلی کے کچھ آثار اب بھی باقی ہیں۔

"حویلی کا جنازہ بھی مردوں کی گھاٹی سے اتر رہا ہے۔"

1257 میں مسمی بوکن خان اور داروغہ اصطبل خاص مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ڈھل محلہ موچی دروازے میں تعمیر کروائی۔ اس مسجد کا صحن وسیع، خوبصورت گنبد، دروازے کی چوکھٹ پر سنگ مرمر کی ایک تختی نصب تھی۔ جس میں لکھا تھا:

چوں ز بکن خان والا منزلت

شد بنا ایں مسجد ذی الاحترام

بہر تاریخش ز ہاتف شد ندا

کعبہ ثانی بنا شد ایں مقام (۱۴)

اس کے دروازے انتہائی خوبصورت اور اس کے ارد گرد باغ ہوا کرتے تھے۔ لیکن آج اس مسجد کی خوبصورتی وہ نہیں رہی جسے کبھی کعبہ ثانی کہا جاتا تھا۔

سادھوؤں کے محلے میں ایک عالی شان مسجد جس کی تعمیر 1266 میں نور محمد سادھواں کے زیر لاگت سے ظہور میں آئی۔ سادھو ایک مسلمان کشمیری یہاں سکونت پذیر ہوا ۔ سادھوؤں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ مختلف شہروں میں نکل جاتے ہیں کوئی فقیر سالک، مجذوب، کوئی شہزادہ، کوئی گدائی بھی کرتا گویا ہر میلے سے روپیہ پیدا کرلانا ان کا کام تھا۔ ان کو دیکھ کر تارڑ لکھتے ہیں ۔

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے

یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

مسجد چینیاں والی، نواب سرفراز خان نے تعمیر کروائی۔ سکھوں کے وقت بھی یہ مسجد آباد تھی لیکن قبضہ مسلمانوں کا تھا جو سنی اور شیعہ دونوں فرقوں کے مخالف ہیں ۔ مصنف کو قدرے مایوسی ہوئی کہ ہم تو چینیوں کی مسجد دیکھنے آئے تھے مگر وہاں نہ تو چینی تھی اور نہ ان کا کوئی زیبائشی طرز تعمیر۔ اب اسے ڈھا کر جدید طرز کا عبادت خانہ بنا دیا گیا ہے۔

محلہ تیر اندازں کے پہلو میں کمانگراں گلی تھی۔ یہاں اعلیٰ پائے کے تیر اور تلواریں بنائی جاتی تھی لیکن وہ زمانے تاریخ کی دھول میں اٹ گئے۔ ثقافت وراثت اور کاریگری سے غفلت کی خاک میں دفن ہو گئے۔ لاہور کے لوہار کاریگر دنیا بھر میں سب سے موثر اور سجیلے ہتھیار بناتے تھے۔ آج یہ دونوں محلے گندگی، جہالت کے اندھیروں اور بدبودار نالیوں، تجاوزات، تجارتی درندگی اور اپنی ثقافت کی درخشندگی کی وجہ سے بے خبر ایسے ہیں کہ ان سے گزرتے ہوئے بھی جی چاہتا ہے کہ اس سے جلدی کیسے گزر جائیں۔

موچی دروازے کے اندر موجود مسجد محمد صالح ۱۰۷۰ میں منشی محمد صالح کمبوہ، صوبہ پنجاب نے تعمیر کروائی تھی اس میں اس مسجد کے خوبصورت میناروں، نقاشی، تراشی، تصویریں داستانوں کا ذکر کیا گیا ہے لیکن آج اس کے کچھ آثار ہی موجود ہیں۔

"جب ہم اپنے ماضی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب کی تاریخ اپنے مخصوص افکار اور سرگرمیوں کی بنا پر دوسرے ادوار سے مختلف ہوتی ہے۔ یہ چیز ہر دور کے فن تعمیر، مصوری اور سنگ تراشی کی ترقیوں اور اسلوبوں میں زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔"(۱۵)

لال کھوہ جہاں برفی فروخت ہوتی تھی۔ اس کی دھوم بہت تھی نہ جانے اسے بھنگ کی مانند گھوٹا جاتا تھا کہ ایک ڈلی کھانے سے آنکھیں اس کے سرور سے بند ہونے لگتی تھی ۔ یہ لال کھوہ اس لیے کہلاتا ہے کہ جو لوگ مرادیں مانگتے تھے وہ یہاں صرف لال دھجیاں باندھا کرتے تھے۔

تارڑ اپنی ایک عادت تانک جھانک کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مسجد بوکن خان کی طرح سنہری مسجد کا بھی دروازہ بند تھا، جھانک کر دیکھا تو اس کے گنبد دھوپ سے سنہرے اور اس کی عمارت بہت شاندار تھی لیکن اب وہ ویران پڑی تھی اور اس کا دروازہ مقفل تھا۔

دل سے شوق رخ نکو نہ گیا

تانکنا، جھانکنا کبھو نہ گیا

ایک لوہار موسی آہن گر جو ذات کا لوہار تھا اور اس سے کئی معجزے منسوب ہیں۔ موسیٰ آہن گر ایک محنتی اور نیک، پرہیز گار، حلال رزق کمانے والا انسان تھا اور اس میں اس کی ایک عورت سے محبت کا ذکر بھی ملتا ہے۔

وہ اکبر اعظم کے دور کے آغاز میں فوت ہوا اور لاہور میں مدفون ہے

پیر طریقت رہبر شریعت

حضرت شیخ موسی آہنگر سہروردی

ہر سال 17 یا 18 صفر کو اس کا عرس منعقد ہوتا ہے۔ آپ کا وصال 962 کو ہوا۔ ان کے مزار میں ایک چراغ اب بھی روشن ہے۔ اس حصے میں بلھے شاہ کے سید ہونے کا ذکر بھی موجود ہے اور لکھتے ہیں۔

جیڑا سانوں سید آکھے دوزخ ملن سزائیاں

جیڑا سانوں رائیں آکھے جنت پینگاں پائیاں

تیسرے باب میں مستنصر حسین تارڑ صاحب نے بڑے مزاحیہ انداز میں بتایا کہ اگرچہ ہم چوہے نہ تھے مگر عادات چوہوں والی ہی تھی۔ چوہوں کی طرح ہماری مرغوب غذا بھی پنیر ہی تھا اور آوارگی بھی چوہوں والی تھی۔ اتوار کے دن تارڑ صاحب اپنے چند قریبی دوستوں کے ہمراہ شہر لاہور کے قدیم محلوں، مکانوں، حویلیوں اور تاریخی مقامات کو کترنے ہی نکلے تھے۔ مستنصر حسین تارڑ زندہ دل انسان ہیں، فکشنی انداز ہے۔ لاری اڈے سے گزرتے ہوئے سجاد علی کا گیت یاد کرتے ہیں۔ "تیرے اور میرے گھر کے سامنے ہے لاری اڈہ، لاری اڈہ"

آگے راستے میں بورڈ نظر آیا جس پر ایک فلم کا اشتہار کچھ یوں تھا۔ "ناز تھیٹر"، "تیرے عشق نچایا" (فیملی ڈرامہ)، "پاکستان میں پہلی بار 100 سانپوں کے ساتھ ایک خوبصورت حسینہ پرفارم کرے گی۔" اس پر تارڑ صاحب کہتے کہ ہمارا بس چلتا تو ہم لاہور کے قدیم شہر کی کھوج یہیں ترک کر کے ناز تھیٹر کی کھوج لگاتے خوبصورت حسینہ کے بدن کے گرد مبلغ سو سانپوں کو دیکھتے اور سانپوں کی قسمت پر رشک کرتے۔

مستنصر حسین تارڑ صاحب نے لاہور کے لنڈے بازار کو دنیا کی سب سے بڑی مارکیٹ قرار دیا۔ استعمال شدہ ملبوسات، جوتوں، جرابوں، جوگرز، دستانوں اور جیکٹوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ

"یہ نہ صرف غریبوں کے تن ڈھکتا تھا بلکہ امراء بھی اس کی گلیوں میں خوش لباس ہونے کے لیے چلے آتے تھے"۔(۱۶)

مستنصر حسین تارڑ صاحب اپنے بارے میں بتاتے ہیں کہ۔

"میں نے کوہ پیمائی کے لیے کسی برطانوی گورے سپاہی کے جو بوٹ خریدے تھے، وہ کسی ایک سپاہی کے نہ تھے۔ ایک بوٹ نو نمبر کا تھا، دوسرا دس نمبر کا تھا۔ یعنی دو مختلف پاؤں کے بوٹ تھے چنانچہ میں ایک کوہ نوردی کے دوران مسلسل لارڈ بائرن کی مانند لنگڑا کر چلتا رہا"۔۔(۱۷)

لنڈے بازار میں ایک شاندار اور عظمت والے شہید گنج کے گوردوارہ کی بڑے مزاحیہ انداز میں ساری منظر کشی کی گئی۔

"ہم سے بڑھ کے توحید کے پرستار سکھ۔۔ صرف گرنتھ صاحب کے سامنے جھکتے ہیں، نہ بابا گرونانک اور اپنے گورو حضرات کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ صرف گرنتھ صاحب کو اللہ تعالیٰ کا زندہ کلام مان کر اس کے آگے ماتھا ٹیکتے ہیں گرنتھ صاحب کی آسائش کا خیال رکھتے ہیں گرنتھ کی رہائش گاہ میں گرمیوں میں ائر کنڈیشن کی ٹھنڈک ہوتی اور سردیوں میں بجلی کے ہیٹر چلائے جاتے ہیں۔"

تارڑ صاحب کہتے کہ عظیم حسین ہمیں گردوارے کے پہلو میں واقع اس قدیم تاریخی کنویں کے پاس لے گیا جہاں پانی میں چھ ہزار سکھوں کا خون تھا۔ مغلوں نے انعام کے عوض سکھوں کو قتل کروایا، باقاعدہ قصاب مقرر کیے۔ ان کی مخالفت مذہب کی بناء پر نہ تھی بلکہ اقتدار اور بادشاہت تھی۔

رام گلیوں میں احمد یہ بلڈنگ جہاں مرزا غلام احمد فوت ہوا تھا۔ لیکن مستنصر حسین کہتے ہیں وہاں ہر گز نہیں جانا۔ برکت علی محمڈن ہال جہاں تاریخ ساز رہنماؤں اور درخشاں لوگوں نے خطاب کیا، وہ تاریخی عمارت بھی زوال پذیر ہو گئی۔ ہال سے نکلتے تارڑ صاحب کی نظر ایک گھاٹی کی جانب لگے ہوئے بورڈ پر پڑی جس پر چمبیر لین روڈ لکھا تھا تو ساتھیوں سے کہا، رک جاؤ۔

"میری حیات کے بچپنے، جوانی اور پھر ادھیڑ عمر کے سب آثار اسی چمبیر لین روڈ میں کہیں دفن ہیں۔ ایک پل کے لیے مجھے سوگوار ہو جانے دیجئے۔"(۱۸)

گھاٹی سے اترتے ہی گوالمنڈی کے اندر "کسان اینڈ کمپنی" تھی۔ ابا جی کا بزنس تھا اور آپ نے اپنا ادبی سفر بھی یہیں سے شروع کیا تھا اندرون شہر سے جتنے بھی جنازے نکلتے تھے اس گھاٹی سے اتر کر میانی صاحب کی جانب لے جائے جاتے تھے اس کا نام مردوں کی گھاٹی پڑ گیا۔

لوہاری بھاٹی بھئی سے سیتلا مندر اب کھنڈر بن چکی ہے۔ بابری مسجد کے انتقام میں مندر کو نیست و نابود کر دیا ہے۔ حسن، رحم اور محبت کے نین نقش والی دیوی خود بے رحمی کا شکار ہو گئی۔

سیتلا مندر میں دیوی کے درشن تو نصیب نہ ہوئے۔ شاہ عالمی میں رنگ محل مشن ہائی سکول کی عمارت دیکھی جو زوال پذیر کا شکار تھی۔ سکول کے عین سامنے محمود ایاز والے محمود غزنوی کے غلام اور محمود ایاز کا مزار ہے۔ افغانیوں چاہے وہ غزنوی ہوں یا ابدالی نے لاہور کی قدامت کو مسمار کیا۔ محمود غزنوی بھی لاہور شکن تھا، نا صرف آبادی کو قتل کیا بلکہ پورے شہر کو ملیامیٹ کر دیا، جاتے ہوئے اس شہر کے کھنڈروں پر ایاز کو حاکم کر دیا اور ایاز نے لاہور کو دل کے قریب کر کے از سر نو تعمیر کرائی اور لاہور پھر سے لاہور ہو گیا۔

"ثقافت کی دریافت، یہ آگاہی کہ ہمارے طرز عمل ہماری اقدار بلکہ ہمارے افکار تک کو نبھاتی اور سنوارتی ہے۔ ثقافت کی یہ دریافت ان دھندلے خطوط کی مانند جو سیال مادے میں بھیگی ہوئی تاریک فلم پر آہستہ آہستہ صورت پذیر ہوتے جاتے ہیں، اسے خفیہ اور لاشعور کی دنیا سے شعور ظاہر کی دنیا میں لے آتی ہے۔"(۱۹)

بلاقی شاہ کا شاندار منیشن، آدھا لاہور جس کا مقروض تھا، اب اس کا منیشن خستہ حالی کا شکار ہے لاہور کی بربادی کا نوحہ مستنصر حسین نے خوب پڑھا ہے۔

تھا جنّتِ نظارہ ترا عہدِ جوانی

پھرتی ہے نگاہوں میں وہ تصویر اب تک

ہیرا منڈی کے بابا مجنوں اور نو گزے کی قبر کا نمک چکھتے، دھیان سنگھ کی حویلی سے گزرے جہاں اب کالج قائم ہو چکا ہے سب ادارے غیر مسلموں کی عنایت میں 1947 کے بعد ان کے قائم کردہ تعمیر کردہ ہر چیز پر ہم نے نئی چیز کی بنیاد رکھ دی

حویلی دھیان سنگھ کے اجاڑ پن سے نکل کر سید مٹھا، خوارزم کے شیریں زبان ولی اللہ کے مزار پر آئے جو اندرون شہر لاہور میں بہت مشہور ہے۔

سفر نامہ لاہور آوارگی میں مستنصر حسین تارڑ نے چوتھا باب ایک دن رہیں لاہور میں کے عنوان سے تیرہ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔
جیسا کہ نام سے ظاہر ہے تارڑ صاحب اس میں لاہوری دروازے سے داخل ہونے کے بعد چوک چکلا سیر کا بیان کرتے ہیں۔
اگرچہ بعد میں اس کا نام بدل دیا گیا لیکن پرانے لوگ وہاں پر بننے والے ناشتے اور پرانے ادوار کی کہانیوں کو آنکھوں کے سامنے لا کر یاد کرتے ہیں۔

یہ نام شرعی طبع نازک کو ناگوار لگتا ہے
اور اسے کوئی شرعی نام عطا کر دیا گیا ہے

اس کی تاریخ کو مسخ تو کر سکتے ہیں، تبدیل نہیں کر سکتے۔
اندرون لاہور کے حصے کی سیر کرتے ہوئے ایک ایسے کمرے میں جا پہنچتے ہیں جہاں مہدی حسن کی ماں رقص کرتی تھی۔
بقول تارڑ:

"صاحب بہت مدت ہوئی جب میں ایک مکان کی سیڑھیاں چڑھتا ایک ایسے کمرے

میں داخل ہوا تھا جہاں کاریگر حضرات جوتوں کو سریش لگا جوڑتے تھے
اور مجھے بتایا گیا یہ وہ کوٹھا ہے جہاں مہندی حسن کی ماں رقص کرتی تھی"(۲۰)

نہال چند کے مندر اور ایک بہت پرانے جھولے کی بوسیدگی کو دیکھتے آگے بڑھتے شیش محل کے گنبد کے عکس کے ساتھ کسی ایسی ناری کا ذکر کرتے ہیں جو ان کی ہیر صاحباں یا کرشن کی کوئی گوپی ہے۔

جھولا کس نے ڈالا رے
ہولے ہولے جھلائے میرا سیاں

شہر لاہور سے کیسے کیسے لوگ نکلے جو شہرت پر جا پہنچے۔ وہ چند ایک نام ہیں: غلام علی خان، امانت علی خان، فتح علی خان، استاد شگن، محمد رفیع، ایران، دیوان آنند وغیرہ۔ محمد رفیع کے گانے سے اس حصے کو ختم کر کے آگے بڑھتے ہیں۔

سہانی رات ڈھل چکی نہ جانے تم کب آؤ گے
نین جب لڑ جائے رے۔۔۔۔
انصاف کا مندر ہے یہ بھگوان کا گھر
ہائے ہم جن کے لیے برباد ہوئے

لاہور کی تاریخ اور ثقافت کے حوالے سے اس کا ہارٹ اٹیک آف ہیر امنڈی ہے جس کی خستہ حالی کا حال بیان کرتے ہیں۔ وہاں کے تمام نشانات مٹ چکے تھے۔ بیان کرتے ہیں پاکستان کے بارے میں ایک دنیا گردنے کہا کہ پاکستان ایک ایسا پوشیدہ راز ہے جو ابھی تک عیاں نہیں ہوا ہے۔ یوں لاہور بھی ایسا مقفل راز ہے جو کبھی نہیں کھلتا ۔جب ہم اس پوشیدہ راز سے پردہ اٹھاتے ہیں تو شاہ حسن کی پکار چلی آتی ہے۔

مائیں نی میں کنوں آکھاں
درد وچھوڑے دا حال نی

پانچواں باب ''رُوپ شہر لاہور کے'' ۲۲ عنوانات پر اور چھٹا باب ایک باب پر مشتمل ہے۔

مستنصر حسین تارڑ آسان لفظوں میں وسیع النظری، زیرک بینی اور خوبصورتی سے تاریخ کے واقعات کو بیان کرتے ہوئے اس شہر یا مقام کو دوام بخشتے ہیں۔ حقائق کو منظر عام پر لانے کے لیے موازنے کی تکنیک سے کام لیتے ہیں۔ وہ زبان و بیان کی چاشنی سے قاری کو انوکھی دنیا سے روشناس کراتے ہیں کہ قاری لحہ بہ لحہ لفظ بہ لفظ ان کا ساتھ دیتا ہے وہ مختلف ممالک کی دنیا کو اتنے دلچسپ انداز سے قارئین کی نذر کرتے ہیں کہ قاری کی آنکھوں کے ساتھ وہاں کے مناظر متحرک ہو جاتے ہیں۔

اصناف نثر کی مختلف تکنیکوں کے ذریعے واقعات و مشاہدات کو ایسے تحریر کرتے ہیں کہ قاری وہاں کے رسوم و رواج اور تہذیب و ثقافت سے بھی واقف ہو جاتا ہے اور اس کی دلچسپی بھی برقرار رہتی ہے۔

دنیا کے ہر قدیم شہر کی طرح لاہور کی آوازیں، صدائیں، سرگوشیاں، روشنیاں الگ اور منفرد ہیں اور یہ ہزاروں برس سے آباد ان بستیوں کی تاریخ، ثقافت اور مذہب سے جنم لیتی ہیں۔ آپ آنکھیں بند کر کے کسی قدیم شہر میں داخل ہو جائیں تب بھی اس کی صداؤں سے پہچان جائیں گے کہ آپ کس شہر میں ہیں۔

''لاہور بہت بوڑھا شہر ہے۔ کئی ہزار سال کی عمر ہو گئی اگرچہ اس کے چہرے کی جھریاں نمایاں ہو چکی ہیں۔ کمر جھک گئی ہے۔ ہاتھوں میں رعشہ ہے۔ بینائی بھی کم ہوتی جاتی ہے تاہم اس کے چم و خم میں ابھی تک فرق نہیں آیا۔ یہ شہر ہمیشہ پھیلتا اور سمٹتا رہا ہے لیکن جس سُرعت سے آج کل یہ پھیل رہا ہے اگر اس نے اسی سُرعت سے سمٹنا شروع کر دیا تو کوئی عجب نہیں کہ کسی دن سفری تھیلے، بلکہ ایک چھوٹی سی ڈبیا میں بآسانی سما جائے اور سچ پوچھئے تو لاہور ہے بھی ڈبیا میں بند رکھنے کے قابل۔ اس سن و سال کے باوجود لاہور کے مزاج میں بہت بچپن ہے اور اس کی بے چین طبیعت کو ایک حال پر اصلاً قرار نہیں۔ لاڈلے بچوں کا ہمیشہ سے یہی حال ہوا کرتا ہے اور لاہور نے تو بڑے ناز و نعم میں پرورش پائی ہے وہاں بڑی مصیبتیں بھی اٹھائی ہیں۔ کچھ مدت سے عجب حالت میں گرفتار ہے۔ جب سے اس کی منہ بولی ماں بی میونسپلٹی اللہ کو پیاری ہوئیں۔ بچارے کا کوئی آسرا نہیں رہا۔ اگرچہ مرحومہ کی زندگی میں بھی اس بچارے کی حالت کچھ اچھی نہیں تھی۔ سر کے بال گرد و غبار میں اٹے ہوئے، چہرے پر چیچک کے داغ، داغ کیا۔ بڑے بڑے گڑھے جنہیں رفو کرنے کے لیے لاکھوں من سیمنٹ کی ضرورت ہے۔''(۲۱)

لاہور کی ایک اور صدا جس کا گلہ گھونٹ دیا گیا ''بوکاٹا'' کی تھی۔

اس حوالے سے لکھتے ہیں:

اک دن رہیں بسنت میں، اک دن رہیں بہار میں

''بسنت کو پہلے تو ایک ہندو یا سکھ تہوار قرار دے کر مطعون کیا گیا اور پھر دھات کی ڈور کو بہانہ بنا کر لاہور کی اس شانداری کے رنگوں پر پابندی لگا دی گئی۔۔ بجائے اس کے کہ مجرموں کی گرفت کی جاتی جو آہنی ڈور کی سپلائی میں ملوث ہیں، پوری بسنت کا گلہ گھونٹ دیا گیا۔''(۲۲)

شالیمار باغ کے میلہ چراغاں، پہلے پیر کا میلہ اور دیوالی کی رونقوں کو ماضی کی یاد بنا کر قاری کے سامنے حقیقت یوں آشکار کرتے ہیں۔

''کیسے کیسے جھولے خواب ہوئے۔۔ اب تو سراب ہوئے۔۔

اگر موت موت ہے اور لاہور، لاہور ہے تو وہ لاہور تو کب کا مر چکا۔

میرا شہر آرزو ایک خواب ہوا، ایک سراب ہوا، تنگ نظری اور تعصب کا شکار ہوا۔۔

اس کے سارے چراغ، سارے دیئے، سب دیپ بجھ گئے۔۔''(۲۳)

مستنصر گہرے مشاہدہ یا قوت مشاہدہ اور بصیرت افروز انداز میں قاری کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ذاتی مشاہدے کو تاریخی واقعات کے ساتھ یوں بیان کرتے ہیں کہ قاری ملک ملک، شہر شہر کی سیر کرنے کے ساتھ ساتھ تاریخ کا مطالعہ بھی ہلکے پھلکے انداز میں کر لیتا ہے۔ وہ بخوبی واقف ہیں کہ تاریخ ایک غیر دلچسپ حقیقت ہے لہذا تاریخی شواہد، رسوم ورواج، عقائد، زبان، مذہبی رجحانات کے ساتھ مقامی وعلاقائی رنگ ایسے بھرتے ہیں کہ مستنصر کی شخصیت غائب ہو جاتی ہے اور قاری اکتاہٹ کا شکار ہوئے بغیر بالمشافہ اپنی تاریخی معلومات میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں کے پلاٹ کی بُنت بہت عمدہ ہے۔ کہیں یہ گمان نہیں ہوتا ہے کہ آپ تارڑ نہیں صرف قاری ہیں۔ ان کے سفر نامے سے افسانوی رنگ جھلکتا ہے۔

شیش محل کے نازک ستونوں اور شیشوں کے نفیس جڑاؤ کو یوں بیان کیا ہے کہ یوں گمان ہوتا ہے کہ اسی جگہ کھڑے خود محو نظارہ ہیں۔

''حویلی کی شستہ ہوتی چھت پر قدم رکھا تو یکدم قدیم لاہور کی آوازیں کانوں میں گونجنے لگیں، شہر کی زندگی میں سے جنم لیتا ہلکا شور، کبوتروں کی غٹر غوں، چھتوں پر دھوپ سینکتی خواتین کی سرگوشیاں اور سردیوں کی دھندلی ہوا کی تازگی جس میں قدیم لاہور کے گلی کوچوں کی سرخ اینٹوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ چھت کے اوپر بوسیدہ ہو چکی لکڑی کے کچھ تختے تھے اور ان میں دو بارشوں سے بھیگے ہوئے خستہ ہو چکے کواڑ تھے۔ نعمان نے انہیں دھکیلا تو سورج کی روشنی ہم سے پہلے اندر داخل ہوئی اور وہاں واقعی ایک عجوبہ شیش محل کے آثار تھے جس کے اکھڑتے اور شکستہ ہوتے، بجھتے ہوئے شیشوں کو روشنی نے جگ مگ کر دیا تھا، سینکڑوں آراستہ شیشوں میں دھوپ کے چراغ روشن ہو گئے۔ شاہی قلعہ، شیش محل کی نسبت بہت مختصر لیکن ہو بہو وہی بلکہ کسی حد تک خوشنمائی میں اس سے بہتر اور دلکش لگتا ہے۔''(۲۴)

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام

مستنصر حسین تارڑ جس رومانوی انداز میں سفر نامہ لکھتے ہیں، وہ ان کا خاصہ ہے۔ قاری کھلی آنکھوں سے سپنے دیکھتا ہے، زیر لب مسکراتا ہے، اپنے احساسات کی گدگداہٹ سے انجانی سرشاری پاتا ہے، وقت کے ساتھ کسی مقناطیسی ڈور کی مانند کھنچا چلا جاتا ہے۔ صدیوں پر محیط تاریخ وتہذیب کی بھول بھلیوں سے کب شاداں وفرحاں باہر نکل آتا ہے، اسے خبر ہی نہیں ہوتی۔

لاہور آوارگی میں بھی قاری خود کو تارڑ صاحب کے ساتھ صوفی صاحب کی دکان سے بچوں کے رسالے کا سالنامہ چراتا اور اگلی صبح مارے شرمندگی کے اسی رازداری سے رکھتا دیکھتا ہے، کبھی سٹیج پر کھڑا سوچتا ہے کہ لاہور بھی قلعی گر ہے، مجال ہے کوئی ایک بھی کم صورت لڑکی نظر آجائے۔ کبھی میڈم نور جہاں کے سریلے لبوں سے یہ الفاظ سن کر مسحور ہو جاتا ہے۔

تارڑ صاحب لکھتے ہیں:

نور جہاں نے مجھے ایک بار کہا تھا کہ "منڈیا تیرا نام بڑا مشکل ہے۔۔ سمجھ نہیں آتی کہ مستنصر کو "س" سے لکھتے ہیں یا "ص" سے۔۔ تو میں نے کہا تھا میڈم آپ "س" سے لکھیں یا "ص" سے، ہمیں تو سواد آجائے گا۔(۲۵)

قاری لاہور کے سینما گھروں میں ماضی کی دھندلی شرابوں کے نشے میں کبھی بھٹک جاتا ہے تو کبھی یادوں کے راستے کا مسافر ہو کر گنگنا اٹھتا ہے

کس کو سنائیں حالِ دلِ زار اے ادا

آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

مستنصر حسین تارڑ جو ۱۹۶۱ میں اپنے باپ کی آرزو پر بظاہر ایک آسودگی سے بھری مغربی حیات کو تیاگ کر گوالمنڈی کی "کسان اینڈ کمپنی" پر آبیٹھے۔ یہیں سے ان کی ادبی شہرت و مقبولیت کے سب کرشمے ظہور پذیر ہوئے۔ لاہور آوارگی کو پڑھتے ہوئے ہر لمحہ اس محبت و عقیدت کا احساس ہوتا رہا جو ہر ذی روح کو اپنی جائے پیدائش سے ہوتی ہے۔ انھوں نے لاہور کی تاریخ، تہذیب اور معاشرت کے نقشے یوں کھینچے ہیں کہ ہم بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں۔

جنے لور نی ویکھیا او جمیا نئی

لاہور کی گلیوں، کوچوں، بازاروں، تھڑوں، مزاروں، درباروں، دروازوں، کی آب و تاب اور زبوں حالی کا حال یوں بیان کیا ہے کہ لاہور خود بولتا، سسکتا اور آہیں بھرتا نظر آتا ہے کہ خدارا مجھے بچالو۔ لاہور کے گوشے گوشے سے تاریخ پکار کر کہتی ہے کہ آجاؤ دیکھو مجھے، جانو مجھے، میں کون ہوں، کیا تھی اور اب کیا ہوں۔ لاہور شہر پر ہمیشہ اولیاء کرام کا خاص کرم رہا ہے۔ خاص بات ہے کہ جو لاہور دیکھتا نہیں، نام بھی سنتا ہے تو عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اردو کے نامور مزاح نگار پطرس بخاری نے اپنے مضمون لاہور میں لکھا ہے:

"ماہرین کا اندازہ ہے کہ دس بیس سال کے اندر لاہور ایک صوبے کا نام ہو گا۔ جس کا دارالخلافہ پنجاب ہو گا۔ یوں سمجھیے کہ لاہور ایک جسم ہے، جس کے ہر حصے پر ورم نمودار ہو رہا ہے، لیکن یہ ورم مواد فاسد سے بھرا ہوا ہے۔ گویا یہ توسیع ایک عارضہ ہے، جو اس کے جسم کو لاحق ہے۔"(۲۶)

لاہور کے میلے، ٹھیلے، تہوار، جشن، سب حکایتیں، سب روایتیں سب سراب ہوئے۔

تارڑ صاحب کہتے ہیں جیسے فراز نے ایک شعر یوں مجھ پر منطبق کر دیا کہ۔۔۔۔

پہلے اس نے مُس کہا، پھر تن کہا، پھر صر کہا

اس طرح اس ظالم نے مستنصر کے ٹکڑے کر دیئے(۲۷)

"تارڑ جغرافیائی سفر کے ساتھ ساتھ تاریخ کی راہداریوں کا سفر کرتے ہیں۔ سو وہ اپنے قاری کو مختلف مقامات اور مظاہر کے حوالے سے تاریخی معلومات بھی فراہم کرتے چلے جاتے ہیں۔"(۲۸)

مصنف کو زبان و بیان پر اللہ تعالیٰ نے خوب ملکہ بخشا ہے۔ وہ وجدان کی آنکھ سے نہ صرف خود دیکھتے ہیں بلکہ قاری کو تخیل کی آنکھ سے دکھاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی فصیح السانی، بلیغ الکلامی اور زورِ قلم سے لاہوری تصویر کا دوسرا رخ قارئین کے سامنے رکھ کر واضح کر دیا کہ سہولت، ترقی اور فلاح کے نام پر لاہور کی شکل ہی بگاڑ دی گئی ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ شہزاد منظر، ''سفر نامہ نگاری ایک ادبی صنف''، مشمولہ سہ ماہی الذبیر، :سفر نامہ نمبر، جلد نمبر ۳۶، ۳۷، شمارہ نمبر ۱، ۳، ۴، اردو اکادمی، بہاولپور، ۱۹۸۸، ص ۲۶

۲۔ قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، اردو سفر نامے انیسویں صدی میں، فوٹو اسٹیٹ پرنٹر، دہلی فروری، ۱۹۸۷، ص ۲۴

۳۔ جمیل احمد انجم، پروفیسر، اردو ادب بیسویں صدی میں، ص ۴۲

۴۔ غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر، پاکستانی ادب کے معمار، مستنصر حسین تارڑ: شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، اسلام آباد ۲۰۱۸، ص ۳۱

۵۔ محمد لطیف، سید، تاریخ لاہور، تخلیقات لاہور، ۲۰۰۴، ص ۴۸

۶۔ مستنصر حسین تارڑ، لاہور آوارگی،، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور ۲۰۲۰ ص ۱۱

۷۔ ایضاً، ص ۱۱

۸۔ محمد لطیف، سید، تاریخ لاہور، تخلیقات لاہور، ۲۰۰۴، ص ۲۶۲

۹۔ ایضاً، ص ۳۲۹

۱۰۔ اردو سفر نامے انیسویں صدی میں، محولہ بالا، ص ۲۱۸

۱۱۔ کہنیالال، تاریخ لاہور،، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور ۱۹۹۰، ص ۳۶۴

۱۲۔ محمد لطیف، سید، تاریخ لاہور، تخلیقات لاہور، ۲۰۰۴، ص ۲۵۵

۱۳۔ ثقافت کا مسئلہ، ہیری سپیرو، مترجم سید قاسم علی، لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۱۷، ص ۵۲

۱۴۔ کہنیالال، تاریخ لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۰، ص ۱۸۴

۱۵۔ ثقافت کا مسئلہ، محولہ بالا، ص ۸

۱۶۔ مستنصر حسین تارڑ، لاہور آوارگی، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور، ۲۰۲۰ ص ۱۰۲

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۱۸۔ لاہور آوارگی، محولہ بالا، ص ۱۱۵

۱۹۔ ثقافت کا مسئلہ، ہیری سپیرو، مترجم سید قاسم علی، لاہور فکشن ہاؤس، ۲۰۱۷، ص ۵۲

۲۰۔ لاہور آوارگی، محولہ بالا، ص

۲۱۔ سندباد جہازی،، محمد حنیف، جدید جغرافیہ پنجاب، لاہور، اردو اکیڈمی پنجاب، ۱۹۴۰، ص ۱۲۵، ۱۲۶)

۲۲۔ لاہور آوارگی، محولہ بالا، ص ۱۹۶

۲۳۔ ایضاً، ص۲۰۶

۲۴۔ ااایضاً، ص۲۲۔۲۳

۲۵۔ ایضاً، ص۲۷۷

۲۶۔ پطرس بخاری، لاہور کا جغرافیہ، مضمون

۲۷۔ لاہور آوارگی، محولہ بالا، ص۲۵۵

۲۸۔ پاکستانی ادب کے معمار، مستنصر حسین تارڑ: شخصیت اور فن، محولہ بالا، ص۶۴